سرورالہدیٰ

جگن ناتھ آزاد اور مطالعۂ اقبال

اقبالیات کے تعلق سے جگن ناتھ آزاد کا نام ایک اہم حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں اقبالیات کا بڑا حصہ اگر آزاد صاحب کی ذات سے وابستہ ہے تو اسے اقبال سے آزاد کی جذباتی اور نفسیاتی وابستگی کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جگن ناتھ آزاد کے معاصرین میں اقبال پر لکھنے والے نہیں تھے، بعض اعتبار سے تو آزاد صاحب کے دو تین معاصرین کو سبھوں پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جگن ناتھ آزاد نے تمام عمر اقبال کو جس طرح اپنی زندگی کا عنوان بنائے رکھا، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ زندگی کے مختلف معاملات کے درمیان اقبال کو کسی نہ کسی حوالے سے یاد کرنا خلوص اور جذبے کی صداقت کا پتا دیتا ہے۔ اقبال پر چھپنے والی تحریروں کو پڑھنا، انھیں جمع کرنا اور ان پر اظہار خیال کرنا اقبال سے سچی وابستگی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ آزاد صاحب جیتے جی اقبال کے خلاف کچھ سننے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اقبالیات کے کئی موضوع ایسے ہیں، جن کا ذکر ان کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ یہ سوال بہت اہم ہے کہ اقبال سے جذباتی و نفسیاتی وابستگی نے اقبال شناسی میں کیا رول ادا کیا ہے۔ آزاد صاحب نے اقبال پر بہت لکھا ہے جو لوگ آزاد کی اقبالیات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، انھیں آزاد صاحب کی تمام تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ صرف چند تحریروں کو پڑھ کر آزاد اور مطالعہ اقبال جیسے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ مطالعے کے بعد اگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی موضوع پر کسی اور شخص نے زیادہ بہتر لکھا ہے تو اس سے آزاد صاحب کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ یہ عین ممکن ہے کہ اقبالیات کے حوالے سے کئی دوسرے ناقدین اور محققین ہمیں زیادہ متاثر کرتے ہوں۔ پروفیسر آزاد کی اقبالیات کا مطالعہ دراصل ایک ایسے ناقد اور محقق کا مطالعہ ہے جو اقبال کے ایک ایک حرف کو عاشق اقبال کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ اقبال کو وہ مقبولیت حاصل نہیں جو میر یا غالب کو حاصل ہے اور یہ کہ اقبال کو ایک طبقے نے ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا۔ اقبال پر اعتراضات کرنے والوں کی تعداد دوسرے اہم اور بڑے شعرا کے مقابلے میں زیادہ رہی۔ آزاد صاحب نے نہایت مشکل حالات میں اقبال کو ایک ہندستانی اور عام انسان کی حیثیت سے سمجھنے اور سمجھانے میں عمر گزار دی۔

اقبالیات کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد کی ایک اہم تحقیقی کاوش مرقع اقبال ہے۔ اقبال کے بارے

میں نہایت اختصار کے ساتھ جتنی معلومات اس میں یکجا کر دی گئی ہیں، وہ اقبال پر اپنے انداز کی اچھی کاوش ہے۔ یہ البم ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے پیش لفظ میں آزاد صاحب لکھتے ہیں:

اقبال ہندستان کے بہت بڑے شاعر ہیں اور اقبال صدی تقاریب کے سلسلے میں ان کے فکر وفن پر جو کام شروع ہوا ہے وہ ہندستانی ادبیات کی ترقی کے لیے ایک نیک شگون ہے۔

مرقع اقبال کے عنوان سے آزاد صاحب نے جو البم تیار کیا تھا اس میں اقبال کی تصویروں اور خود اقبال کے ہاتھ کی تحریروں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس البم کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ اقبال کا شجرۂ نسب
۲۔ توقیت اقبال
۳۔ فہرست تصاویر
۴۔ اقبال اور ان کا خاندان
۵۔ اقبال کے اساتذہ
۶۔ اسکول کالج اور یونیورسٹی کی اسناد
۷۔ تو ابھی رہ گزر میں ہے قید مقام سے گزر
۸۔ اقبال اور مسجد قرطبہ
۹۔ اقبال اصحاب اور احباب کے ساتھ
۱۰۔ مکاتیب اقبال اور مسجد قرطبہ
۱۱۔ اقبال کی پہلی اشاعتوں کے سرورق
۱۲۔ کلام اقبال بخط اقبال
۱۳۔ اقبال کی اردو تحریر
۱۴۔ اقبال کے انگریزی خطوط بخط اقبال
۱۵۔ اقبال کا آخری سفر

اقبالیات کے تعلق سے جگن ناتھ آزاد نے جو کام کیا ہے، اس کی فہرست طویل ہے۔ چند اہم کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ اقبال اور اس کا عہد
۲۔ اقبال اور مغربی مفکرین
۳۔ اقبال کی کہانی
۴۔ اقبال ۔۔ زندگی شخصیت اور شاعری
۵۔ اقبال اور کشمیر
۶۔ بچوں کا اقبال

۷۔ مرقع اقبال

۸۔ فکر اقبال کے بعض اہم پہلو

۹۔ محمد اقبال ... ایک ادبی سوانح حیات

اقبال کی شاعری کو پڑھ کر ہم جن مسائل سے دوچار ہوتے ہیں ان مسائل کا تعلق بڑی حد تک اقبال ہی کی شاعری سے ہے۔ خصوصاً شعری ہیئتوں کے تعلق سے ناقدین نے جو مباحث پیش کیے ہیں اور جن بنیادوں پر ایک صنف کو دوسری صنف سے ممتاز اور مختلف قرار دیا ہے، اقبال کے یہاں ان کی کوئی پاس داری نظر نہیں آتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نظم اور غزل کے سلسلے میں کسی سکّہ بند اصول و قاعدے کو تخلیقی عمل کے منافی سمجھتے تھے۔ کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب اقبال ایک مطالعہ میں اس بات کی شکایت کی ہے کہ اقبال مربوط نظم نہیں کہتے۔ برخلاف اس کے، ان کی غزلوں میں ایک ربط کا احساس ہوتا ہے۔ اقبال کے معترضین کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ اقبال کے یہاں جب خطابت غالب آ جاتی ہے تو شعری حسن زائل ہو جاتا ہے۔ آزاد صاحب اقبال کے حوالے سے ان اعتراضات سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ انھوں نے ان کو سامنے رکھ کر جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک مضمون ''اقبال، خطابت اور شاعری'' ہے۔ پروفیسر آزاد نے یہ بتایا ہے کہ ایک اچھی شاعری میں خطابت کا انداز بھی ہو سکتا ہے اور یہ کہ خطابت کا تعلق فنی ضرورت سے ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے اس مضمون کا محرک کلیم الدین احمد کی کتاب اقبال ایک مطالعہ ہے۔ جن لوگوں نے کلیم الدین احمد کی یہ کتاب پڑھی ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کلیم صاحب کے دوٹوک اور بے باکانہ انداز سے آزاد صاحب کو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی۔ اس کا کچھ کچھ اندازہ آزاد کے ان جملوں سے ہو جاتا ہے جو انھوں نے اپنے اس مضمون میں کلیم الدین احمد کے تعلق سے لکھے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کلیم الدین احمد نے اقبال پر جو بھی اعتراض کیا ہو لیکن انھوں نے اقبال کی جس طرح پذیرائی کی ہے اور فنی و شعری محاسن کے سلسلے میں جن پہلوؤں کو صرف اقبال سے وابستہ کر کے دیکھا ہے، وہ اقبال کے تئیں ان کے غیر جانبدارانہ رویّے کو ظاہر کرتا ہے۔ بہرحال آزاد کا یہ مضمون بہت ہی دلچسپ ہے کہ انھوں نے کلیم الدین احمد کے اعتراضات کا جواب بڑے ہی جذباتی انداز میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

..... بلکہ یہ کہوں گا کہ ادبی تنقید کسی فارمولے کا نام نہیں ہے کہ آپ خاردار تاروں کا ایک فریم ورک بنالیں اور شاعری ایسی نازک اور لطیف تخلیق کو اس فولادی پنجے کے حوالے کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فولادی پنجہ تو ان نرم و نازک شگوفوں اور کلیوں کو مجروح کر دے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ طے کر کے اپنی بات شروع کرنا کہ خطابت اور شاعری میں بیر ہے اور یہ کہ خطابت شاعری نہیں ہو سکتی، دنیا بھر کی عظیم شاعری سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کرنے کے مترادف ہے۔

اگر ہم اس بات کو تسلیم نہ بھی کریں کہ شاعری کے ساتھ ترسیل یا ابلاغ کا مقصد بھی وابستہ ہے، اس بات سے انکار نہ ہو سکے گا کہ اگر شاعر اپنے آپ سے ہی بات کرتا ہے تو بھی ایک طرح کی خطابت ہے اور خطابت جب شاعری میں ڈھل جاتی ہے تو خطابت اور شاعری میں کوئی بیر نہیں رہتا۔

پروفیسر آزاد کے یہ خیالات اقبال کی شاعری میں موجود خطابیہ انداز سے متعلق ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کو جگن ناتھ آزاد کی یہ باتیں بہت سرسری معلوم ہوں لیکن آزاد کی نظر میں شاعری کا ایک ایسا پیمانہ اور نمونہ ضرور ہے جس میں شاعری اور خطابت کا فرق مٹ جاتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب کے ایک حصے میں اقبال کی پانچ نظموں (۱) خضر راہ (۲) طلوع اسلام (۳) ذوق وشوق (۴) مسجد قرطبہ (۵) ساقی نامہ کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ آزاد صاحب اپنے مضمون میں ''خضر راہ'' کا سب سے پہلے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں اقبال کی ایک نظم ''خضر راہ'' کا ذکر خاص طور سے کروں گا کیونکہ اس نظم کو کلیم الدین احمد نے بالخصوص اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے۔

اگر ''خضر راہ'' ایسی نظم ہے جسے پروفیسر آل احمد سرور نے اردو شاعری کا نیا عہد نامہ کہا ہے، اس سے پہلے اردو شاعری میں موجود نہیں تھی اور یہ اپنے انداز کی پہلی نظم ہے تو ہمیں نظم کی ساخت کو، اس کی بنت کو، اس کے سیاق و سباق کو، اس کے اسلوب کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، نہ یہ کہ ہم اس پر پتھر پھینکنا شروع کر دیں۔ بقول آل احمد سرور: سید سلیمان ندوی نے یہ نظم پڑھ کر اقبال کو لکھا تھا کہ اس کے بعض حصوں میں وہ بات نہیں ہے جو 'شمع اور شاعر' میں ہے۔ اگر مجھے اس کا جواب دینا ہوتا تو میں یہ کہتا کہ اس میں 'شمع اور شاعر' والی بات اس لیے نہیں ہے کہ 'شمع اور شاعر' نہیں ہے۔

جگن ناتھ آزاد کے ایسے جذباتی رویّے کا اظہار ان کی اکثر تحریروں سے ہوتا ہے۔

کلیم الدین احمد، نظم ''خضر راہ'' کو غیر مربوط کہتے ہیں۔ آزاد نے کلیم الدین احمد کے ان اعتراضات کے جواب میں اقبال کا ایک اقتباس پیش کیا ہے کہ میں اسے رنگین بنانا نہیں چاہتا تھا۔ آزاد صاحب نے اس نظم میں موجود فکری ربط کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کلیم الدین احمد نے ایسے اعتراضات ''طلوع اسلام'' اور دوسری نظموں کے سلسلے میں بھی کیے ہیں۔ اس ربط کو واضح کرنے کے لیے آزاد نے جن سیاسی، سماجی اور تاریخی حوالوں کو پیش کیا ہے، وہ اقبال کی شاعری کے تاریخی سیاق کو سمجھے بغیر ممکن نہیں، مثلاً:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

کلیم الدین احمد کو یہ شعر سپاٹ اور غیر شاعرانہ نظر آئے تو آئے، کسی ایسے نقاد کو جسے اردو شاعری سے ذرا بھی لگاؤ ہے، اس شعر میں حسن و معانی نظر آئے گا۔ اسے نثر میں بیان کرنے کے لیے، بیان کرنے والے کو پہلی جنگ عظیم کی ساری تاریخ بیان کرنا ہوگی۔ مکّہ کے شریف حسین کا کردار بیان کرنا ہوگا اور ترکوں کی جانبازی پر روشنی ڈالنا ہو گی۔

پروفیسر آزاد نے اقبال کی شاعری میں جس طرح ربط قائم کرنے اور اسے تاریخی حوالوں سے سمجھانے کی سعی کی ہے، اس سے انکار ممکن نہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ تاریخی حوالے کلیم الدین احمد کی نظر میں بھی رہے ہوں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کی نظموں میں اگر ربط کی کمی ہے تو اس کو قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ

نہیں۔ یہ اقبال ہی نے کہا تھا:

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اقبال کو پڑھتے ہوئے جن دقتوں کا سامنا کرتے ہیں، ان کا اظہار نہ کریں۔ اصل میں ربط اور بے ربط کی بحث کو شعری ہیئتوں کے حوالے سے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ بھی اقبال جیسے شاعر کو ادبی ہیئتوں کے عالمی تصور کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ اس تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''اردو غزل کی روایت اور اقبال''، شاید ایسا پہلا مضمون ہے جس میں علمی اور معروضی طریقے سے شعری ہیئتوں کے سلسلے میں اقبال کے تصوّر کو سمجھنے اور شعری ہیئتوں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبال کی پوری شاعری کے افکار و موضوعات کو دیکھا جائے تو ان موضوعات کی تہ میں عصرِ حاضر کا شعور کار فرما دکھائی دے گا۔ اگر اقبال نے ماضی کی روایات سے استفادہ کرتے ہوئے روایات کے تئیں کہیں اپنی ناراض یا ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے تو اس میں بھی عصرِ حاضر کے مسائل اور میلانات کا دخل ہے۔ لہٰذا اقبال کی شاعری کا ایک اہم مسئلہ عصر حاضر رہا ہے، جگن ناتھ آزاد نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''اقبال اور اس کا عہد'' کے موضوع پر جو مضمون لکھا ہے، اسے پڑھ کر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اقبال کو اپنے دور میں کن مسائل کا سامنا تھا اور وہ ان مسائل کو کس طرح حل کرنا چاہتے تھے۔ دراصل ادب میں ایسے مسائل اور ان کو حل کرنے کی باتیں بہت لوگوں کے نزدیک غیر ادبی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے ہندستان کی غلامی اور اس کے نتیجے میں ہندستانیوں کی تہذیبی زندگی کے مسائل اور عالمی سطح پر مشرق و مغرب کے تضادات ان سب کو سامنے رکھ کر اقبال کے فکری سروکار کی نشاندہی کی ہے۔ آزاد نے تصوّف کے بارے میں لکھا ہے کہ اقبال نے اس میں کیا نیا پن پیدا کیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں امیر خسرو اور غالب کا ایک ایک شعر پیش کرنے کے بعد اقبال کا شعر درج کرتے ہیں:

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست

(امیر خسرو)

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

(غالب)

آزاد صاحب لکھتے ہیں:

تو وہ اپنی بلند خیالی اور مضمون آفرینی کے باوجود بڑی حد تک تصوف کے اس دائرے میں محدود و محصور رہتے ہیں جو ایک زمانے سے ہماری شاعری کی متاع چلا آ رہا ہے لیکن اقبال جب کہتے ہیں:

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

تو وہ امیر خسرو اور غالب سے ایک قدم اور آگے جاتے ہیں اور اپنی فغاں سے کعبہ و سومنات میں رستخیز برپا کرتے ہوئے فکر کی انتہائی نازک منزلیں طے کرتے ہیں اور اس انداز فکر کی بدولت وہ تصوف کو محض آرایش سخن ہی نہیں بناتے بلکہ اس کی مدد سے اپنے عہد کے دروازے پر دستک دیتے۔

جگن ناتھ آزاد کی نظر میں اقبال کی شاعری کے اتنے رنگ اور نمونے ہیں کہ انھیں اپنی تحریر و تقریر میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایک اور بات جو بے حد اہم ہے وہ یہ کہ آزاد، اقبال کے تعلق سے ہمیشہ یہ بات پیش نظر رکھتے ہیں کہ کسی موضوع، لفظ، ترکیب کو اقبال سے پہلے کے شعرا نے کس طرح استعمال کیا ہے اور اقبال نے اس کی پیش کش میں کیا خوبی پیدا کی ہے۔ یہ بات ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اقبال کے یہاں زندگی مسلسل سفر کا نام ہے۔ مختلف حوالوں سے اقبال نے زندگی کی حرکت و حرارت کو پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تصوف بھی اقبال کے نزدیک صرف اپنی ذات کی تطہیر کا نام نہیں بلکہ اس سے بھی کام لیا جانا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد نے اقبال کی انفرادیت کو ایک شعر سے واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آزاد نے اقبال کی شاعری میں موجود عقل اور عشق کی کشمکش میں عقل کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

اگر ہم اس وہم میں گرفتار ہیں کہ اقبال نے عقل پر عشق کی برتری تسلیم کی ہے یا اقبال عشق کو عقل کا تضاد سمجھتے ہیں تو یہ کلام اقبال کے، ہمارے بے احتیاط مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اول تو اقبال نے عشق اور عقل یعنی دانش نورانی کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کھینچی..... دوسرا عقل کی برتری اور فضیلت کی اہمیت اقبال کی نظر میں کبھی کم نہیں ہوتی بلکہ ان کا عشق دراصل دانش نورانی کا ایک پہلو ہے۔

پروفیسر آزاد نے اقبال کے حوالے سے عشق اور عقل کے درمیان جس رشتے کی بات کی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر عشق اور عقل کے اپنے کچھ تقاضے ہیں۔ خود اقبال کے یہاں عشق جس قوت کا علامیہ بن جاتا ہے، اس کے لیے فرزانگی سے کہیں زیادہ دیوانگی کی ضرورت ہے۔ ان کے یہاں اگر عقل کی برتری کی مثالیں ہیں تو عشق کی عقل پر فوقیت کے نمونے بھی ہیں:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

دراصل اقبال کی دانش مندی کی مثالیں ان کے کلام سے جا بجا مل جاتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایسا شاعر جو مشرق و مغرب کے فلسفے سے پوری طرح آگاہ ہو اور جس کی نظر دنیا کی تاریخ، تہذیب پر اتنی گہری ہو، اس کی آنکھوں میں مستقبل کا ایک خواب بھی ہے، وہ کیوں کر دیوانگی کی باتیں کر سکتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کا یہ جملہ نہایت ہی بامعنی ہے کہ ان کا عشق دانش نورانی کا ایک پہلو ہے۔

جگن ناتھ آزاد کا ایک اور اہم مضمون: 'انسان اقبال کی نظر میں' ہے۔ اقبال کو پڑھنے کے بعد زندگی کی حرکت و حرارت کے ساتھ ایک دوسرا احساس جو تیز تر ہوتا جاتا ہے، وہ عظمت آدم ہے۔ اقبال کو ایک مخصوص فرقے اور قوم تک محدود کرنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود روشن خیال طبقہ اقبال کو ایک بڑے اور اہم شاعر کی حیثیت سے پڑھتا ہے۔ آزاد نے اپنے اس مضمون میں اقبال کی پوری شاعری کو سامنے رکھ کر عظمت آدم کے تئیں اقبال کے خیالات کو ایک مرکز کی طرف لانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کو پڑھتے ہوئے بعض اوقات ہم جن تضادات کے شکار ہوتے ہیں، وہ ہماری کم علمی کا نتیجہ بھی ہے، لہٰذا آزاد نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کی فکر کو پورے سیاق میں دیکھنے کی ضرورت ہے اور عام طور پر لوگ تاریخی حوالے سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے اقبال کے بارے میں غلط قسم کی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کی نظر اقبال کے تعلق سے ان تمام تضادات پر رہی ہے۔ اس مضمون سے مثالیں ملاحظہ کیجیے:

> اس ضمن میں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کا عظمت آدم کا یہ تصور محض خالی خولی ایک جذباتی تصور ہے یا اس میں ایسے عوامل شریک ہیں جن کی بنیاد میں شعوری اور سماجی حقیقتیں کام کر رہی ہیں.....
>
> زندگی کا یہ کارخانہ اقبال کی نظر میں محض ذاتی یا غیر ذی روح عناصر باہمی کا نتیجہ ہے چنانچہ آغاز کائنات سے لے کر انسان کی ظہور پذیری تک کی منازل محض طبیعیاتی اور کیمیاوی اصطلاح میں بیان کرنا اقبال کے نظام فکر کے ساتھ متصادم ہونے کے مترادف ہے۔ اس لیے اقبال کی شاعری میں اقبال کا نظریہ انسان تلاش کرنے کے لیے اس تصور کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا کہ انسان کی تخلیق اس مادے سے ہوئی ہے جس کا مقدر انجام کار ایک غیر متحرک اور جامد صورت اختیار کرنا ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے اس بات پر خاصا زور دیا ہے کہ اقبال مادے کے ذریعے انسان کی عظمت کی بنیادیں تلاش نہیں کر سکتے تھے، ان کے لیے سب سے محفوظ اور اچھا راستہ روحانیت کا تھا اور یہ کہ انسان صرف اور صرف خدا کی تخلیق ہے۔ پروفیسر آزاد نے اقبال کی شاعری سے مثالیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر سمجھایا ہے کہ اقبال انسان کو کس کس نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ ان تمام نظریات کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے تو ہماری الجھن بڑھ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں کہ اس خیال کو مکمل نہ سمجھا جائے بلکہ اقبال کے اس خیال سے وابستہ کر کے دیکھا جائے۔ خدا اور بندے کے رشتے کی نوعیت اقبال کے یہاں جو صورت اختیار کرتی ہے اور اس سے جو اختلافات پیدا ہوتے ہیں، وہ کسی بھی ذہن اور صاحب علم شاعر کا مقدر رہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے جگن ناتھ آزاد سامنے لانا چاہتے ہیں:

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصوّر سے گلہ رکھتا ہوں

و لیکن بندگی استغفراللہ
یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجوست
چوں ما نیازمند و گرفتار آرزو است
گاہے بہ برگ لالہ نویسد پیام خویش
گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہاؤ ہوست

ان اشعار کے تعلق سے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

لیکن یہ اقبال کی بنائی ہوئی خالق ومخلوق کے رشتے کی مکمل تصویر نہیں بلکہ اس تصویر کے متعدد پہلوؤں میں سے محض ایک پہلو ہے۔ ایک اور پہلو جو اس تصویر میں شامل ہے، یہ ہے:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ان تمام پہلوؤں میں جو اقبال کے قائم کیے ہوئے خدا اور انسان کے رشتے کی محض ایک جھلک پیش کرتے ہیں کہ خواہ بندگی اقبال کے لیے دردِ سر ہو یا مقامِ بندگی دے کر اقبال شانِ خداوندی لینے کو بھی تیار نہ ہوں یا خدا انسان کی تلاش میں سرگرداں ہو، ایک نکتہ آئینے کی طرح روشن ہے اور وہ ہے ذاتِ مطلق سے الگ انسان کا اپنا وجود۔

لیکن اقبال 'سوامی رام تیرتھ' والی نظم میں یہ کہہ چکے ہیں:

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے تاب تو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہرِ نایاب تو

پروفیسر آزاد اپنے ایک اور مضمون 'اقبال کی شاعری میں تصوف' میں رقم طراز ہیں:

لیکن بعد میں اپنے اس تصور میں انھوں نے ترمیم کی اور یہ نظریہ پیش کیا کہ کمالِ انسان ذاتِ مطلق میں گم ہونا نہیں بلکہ اس کا کمال عبادت یہ ہے کہ وہ خدا کی ہستی کے نزدیک اور قریب سے قریب ہوتا جائے لیکن اپنی ہستی کو گرفتار نہ ہونے دے۔

کسی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین افکار و موضوعات سے نہیں بلکہ لسانی نظام سے ہوتا ہے۔ آزاد ۳۰/اپریل ۱۹۸۰ء کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں 'اقبال کی اردو شاعری' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں:

معزز خواتین وحضرات! اقبال کی شاعری کا ذکر کرتے ہی بات کا رخ بالعموم سیاسی، مذہبی اور سماجی نظریات کی جانب مبذول ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری پر کچھ کہنے سننے کے عوض ان کا فلسفۂ حیات اور اس سے وابستہ مسائل موضوعِ گفتگو بن جاتے ہیں۔ اس گفتگو میں 'خودی' سے لے کر 'تصورِ زمان ومکان' تک سب کچھ زیرِ بحث آ جاتا ہے، لیکن اقبال کی شاعری پر کم ہی اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔

اس تقریر میں پروفیسر آزاد نے اقبال کی اردو شاعری کے لسانی نظم کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ اقبال کے

ناقدین سے شکایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اقبال کو ایک شاعر کی حیثیت سے دیکھنے کی بجائے مفکر اور فلسفی کے طور پر دیکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال پر جو تنقید لکھی گئی ہے اس کا بڑا حصہ افکار و موضوعات کی تشریح و تعبیر سے مخصوص ہے، اور اس حصے میں خود آزاد صاحب کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کے تعلق سے افکار و موضوعات کو نظر انداز کر کے صرف ان کی شاعری کو موضوع گفتگو بنانے کی بات کر کے اقبال شناسی کے ایک بنیادی اور اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کم و بیش بیس سال پہلے انھوں نے یہ بات کہی تھی: ''اقبال کے فکر و فلسفے اور موضوعات پر اتنا کچھ لکھنے والا ادبی نقاد یہ محسوس کرتا ہے کہ موضوعات سے کوئی شاعر اہم یا بڑا نہیں ہوتا۔'' ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کے کلام پر سر دُھننے کی بجائے اقبال کے کلام کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔ اس مطالعے کے دوران اقبالیات پر آزاد کے تحقیقی مضامین ہماری مشکلات کو حل کر سکتے ہیں لیکن اس کا فیصلہ جلد بازی میں نہیں کیا جا سکتا۔